ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.2 (2026)
(April to June)

منٹو کے افسانوں میں جارحیت کے عناصر: فرائیڈ کے تصورات کی روشنی میں

Elements of Aggression in Manto's Short Stories: In the Light of Freud's Theories

ڈاکٹر فوزیہ مقبول
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ فاطمہ جناح گریجوایٹ کالج برائے خواتین چونا منڈی، لاہور

Dr. Fauzia Maqbool
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Fatima Jinnah Graduate College for Women Chuna Mandi, Lahore

Article Details
Received:
May 20, 2026
Accepted:
May 25, 2026
Online Published:
June 30, 2026

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Saadat Hasan Manto is regarded as one of the most significant fiction writers in Urdu literature, whose short stories profoundly portray human psychology, social oppression, sexual complexities, and the trauma of the Partition of India. The element of aggression appears prominently in his fiction through physical violence, psychological disturbance, sexual conflict, social revenge, and moral disintegration. This study explores the elements of aggression in Manto's short stories in the light of the psychoanalytic theories of Sigmund Freud, particularly his concepts of Eros (life instinct), Thanatos (death instinct), the unconscious mind, repression, and subconscious desires. According to Freud, suppressed emotions and unconscious drives often emerge in the form of aggressive behavior, and these psychological impulses are vividly reflected in Manto's characters. Manto's depiction of brutality, fear, sexual anxiety, and human savagery during the Partition reflects a deep connection with Freudian psychoanalysis.

Key words: Saadat Hasan Manto, Urdu literature, psychological disturbance, unconscious, Manto's characters, Partition reflects

کارل مارکس نے اپنے فلسفے میں معاشی عوامل کی زندگی کی اساسی بنیاد میں قرار دیا تھا۔ فرائیڈ نے یہ بنیادیں نفسیاتی عوامل میں تلاش کیں اور تمام تر انسانی اعمال و افعال کا محرک ذہنی کشمکش کو قرار دیا۔ یہ جدید نفسیات کا نقطہ آغاز تھا۔ اس سے قبل نفسیات کا علم تو موجود تھا لیکن اسے فلسفے کی ہی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں علوم کی ترقی کے ساتھ جہاں اخلاقیات، جمالیات، سیاسیات، اور عمرانیات وغیرہ کو فلسفے سے الگ کر کے مدون کیا گیا وہاں نفسیات کی بھی علیحدہ حیثیت متعین ہوئی۔ اس سلسلے میں جرمن فلسفی ڈاکٹر وزٹ نے ۱۸۷۹ء میں نفسیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کر کے پیش رفت کا آغاز کیا لیکن اس علم کی با قاعدہ نظری بنیادیں فرائیڈ ہی کے ذریعے ہم پہنچیں۔ سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات کو کلاسیکل تحلیل نفسی کہا جاتا ہے فرائیڈ نے اپنے اس نظریے کی تشریح ایک با قاعدہ فلاسفی کے تحت کی اور مختلف حوالوں سے اس سلسلے میں دلائل بہم پہنچائے۔ بنیادی طور پر اس فلاسفی کے چار تاریخی زاویے ہیں۔ اول شعور کی سطحیں جس میں شُعور، لاشعور اور تحت الشعور شامل ہیں۔ دوم شخصیت کے تشکیلی عناصر جو اڈ (Id)، ایگو (Ego) اور سُپر ایگو

(Super Ego) ہیں۔ اڈ بے تنظیم حیوانی اور خام ہے۔ یہ ہر فرد میں تاحیات ہوتی ہے۔ یقیناً یہ نہ تو کسی اخلاقیات کو مانتی ہے اور نہ اچھے بُرے کی تمیز جانتی ہے۔ ایگو (Ego) اڈ (Id) کی کسی قدر سنبھلی ہوئی حالت کا نام ہے اور سپر ایگو (Super lgo) انسانی شخصیت کا وہ متحرک عنصر ہے جو مذہب، اخلاق اور سماجی قدروں کے تابع رہ کر کام کرتا ہے۔(۱)

فرائیڈ نے شخصیت کے حوالے سے ایک اور تص:ور بھی پیش کیا جو یہ ہے۔

سوئم: شخصیت کی حرکیات (Dynamics of Personality) اس تصور کے تحت شخصیت کے تحرک کو دو جبلتوں کے تابع قرار دیا گیا۔ جہت حیات (Life Instincts) اور جہتِ مرگ (Death Instincts ۔ جہتِ حیات انسان کو اپنی زندگی بر قرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے سرگرم رکھتی ہے جب کہ جہتِ مرگ انسان کو موت کی طرف بڑھاتی ہے یہ جہت جب زور پکڑتی ہے تو انسان لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہوتا ہے۔ قتل و غارت، لوٹ مار اور گالی گلوچ کرتا ہے، نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہی جہت جب قوموں میں زور پکڑتی ہے تو وہ جنگیں لڑتی ہیں۔ چہارم: شخصیت کی نشو و نما ہے جس میں بچپن کے واقعات کو بہت زیادہ اہمیت ہے حاصل ہے۔ جہاں تک اردو افسانے میں نفسیات کے درود کا تعلق ہے تو یہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ممکن ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دور ایسا تھا جس میں ہندو مسلم کشمکش، انگریزوں کے خلاف مزاحمت، سماجی اور مذہبی تبدیلی کے حوالے سے جدید و قدیم کے درمیان تصادم اور سماجی الٹ پھیر کے باعث متنوع ذہنی کیفیات جنم لے رہی تھیں۔ زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی عکاسی اس سے قبل بھی اردو افسانے میں موجود تھی اور بعد میں بھی یہ تسلسل جاری رہا لیکن جدید نفسیات نے اس میں زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔(۲) لہٰذا ترقی پسند افسانے کے ساتھ نفسیات کے تحت بھی افسانہ لکھا جانے لگا۔ اُس زمانے میں نفسیات کے تحت افسانہ لکھنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

سگمنڈ فرائیڈ کے اثرات، مواد اور تکنیک دونوں میں تنوع کا باعث بنے۔ نفسیاتی الجھنوں کے ضمن میں ابتدائی نام احمد علی محمد حسن عسکری منٹو، بشیر احمد اختر، عزیز احمد، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے ہیں۔"(۳) درج بالا افسانہ نگاروں میں سے منٹو کے افسانوں کا تجزیہ فرائیڈ کے تصور جبلت مرگ کے حوالے سے کیا جارہا ہے۔ منٹو کی شخصیت اور افسانے دونوں میں جارحیت کے عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجید امجد نے جب "منٹو" نظم لکھی تو اس میں منٹو کی شخصیت میں موجود جارحیت کو بہت نمایاں کیا نظم کچھ یوں ہے:

دو منٹو

میں نے اُس کو دیکھا ہے
اُجلی اُجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں پھیلتی بھیڑ کے اوندھے اوندھے
کٹوروں کی طغیانی میں جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے
دنیا تیرا حسن یہی بدصورتی ہے دُنیا اُس کو گھورتی ہے
شور سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال کون
ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بام زماں پر پھینکا ہے؟
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پر پیچ دھندلکو میں

مقدمات چلائے گئے مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر واقعی منٹو یہ افسانے لکھ کر کسی جرم کا مرتکب ہوا تھا تو اسے سزا کیوں نہیں دی گئی اور صرف جرمانے کے عوض چھوڑ دیا گیا۔ اس ضمن میں سوال پیدا ہوتا ہے کیا حقیقتاً منٹو مجرم تھا یا نام نہاد معاشرتی ٹھیکیداروں نے اپنے چہروں کے نقاب اترتے دیکھ کر محض اُسے خوف زدہ کرنے کے لیے اُس پر مقدمات چلائے تاکہ وہ آئندہ ان موضوعات پر لکھنے کی جرأت نہ کرے۔ (۶) اگر منٹو جو دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن، اپنے ان حملوں سے بھی باز نہ آیا۔ وہ سزا سہتا رہا مگر اپنے افسانوں میں وہی پیش کرتا رہا جو وہ پیش کرنا چاہتا تھا اس کا مقصد معاشرے کے نام نہاد قوانین کی دھجیاں بکھیرنا تھا جو فرد کی آزادی کو سلب کرتی ہیں۔ وہ اور معاشرہ باہم متصادم ہی رہے۔ منٹو فرد کی آزادی کا قائل تھا اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتا رہا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں: منٹو انسانی نفسیات کا گہرا نباض ہے۔ اس کی ہر کہانی کو یہی نفسیاتی شعور حقیقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس شعور کے سہارے سے رومانی موضوعات تک اس کے یہاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی میں اس نے کسی نہ کسی اہم نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے... زندگی کے معاملات اور کرداروں کی حرکات وسکنات کو پیش کرتے ہوئے یہ نفسیاتی شعور اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے۔'(۷)

منٹو کے نفسیات سے بابت شعور اور نفسیات کی تھیوری بالخصوص فرائیڈ کے نفسیات کی نظریات کے مختلف پہلوؤں کو ان کے افسانوں میں با آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان افسانوں میں سے ایک افسانہ "ہتک" ہے اس افسانے کا موضوع ایک طوائف کی معاشرے کے رویوں کے خلاف ایک احتجاج اور جارحیت ہے۔ معاشرے کا ایک فرد جو ایک مرد ہے اس طوائف کی تحقیر کرتا ہے اور اس کی عزت نفس پر حملہ کرتا ہے اور سوگندھی جو معاشرے کی دھتکاری ہوئی عورت ہے جب اسے زہر خند الفاظ کے استعمال سے اسے ایک بار پھر دھتکارا جاتا ہے تو اس کے اندر ایسا طلاتم اور تموج پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنا غصہ ان چار مردوں پر اتارتی جن کی تصویریں اس نے یادگار کے طور پر اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کی ہوتی ہیں۔ ان چاروں میں سے اُس کے غصے کا سب سے زیادہ نشانہ مادھو بنتا ہے اور اپنا غصہ نکالنے کے بعد وہ اپنے خارش زدہ کتے کے ساتھ سو جاتی ہے۔ سیٹھ جو اُس کا گاہک ہے اس کے منھ سے ادا ہونے والا ہونہہ بہت سے معانی لیے ہوئے ہے۔ ان سارے معانی کو سوگندھی اپنے خیالات میں تلاش کرتی رہتی ہے۔ یہ ہونہ یہ صحیح کا کام کرتا ہے اور وہ ساری باتیں جو سوگندھی کا شعور روکے ہوئے ہوتا ہے اور جنھیں وہ نظر انداز کرتا رہتا ہے وہ سب کی سب باہر آجاتی ہیں وہ ارد گرد کی چیزوں سے اپنے اندر سے نکلنے والی نفسی توانائی پر بند باندھنے کی کوشش کرتی ہے یعنی اس کی فوق الانا شعور کی مد سے لاشعور سے نکلنے والی نفسی توانائی کے اخراج کی کوشش کرتی ہے اور بالآخر اس ساری نفی توانائی کے اخراج کا نشانہ مادھو بنتا ہے۔

مادھو بھی اگرچہ سوگندھی کے لیے بہت زیادہ مخلص نہیں تھا۔ وہ سوگندھی کو مختلف حیلوں بہانوں سے کوستا رہتا تھا۔ محبت کا جھوٹا ڈراما کرتا تھا مگر سوگندھی کے لیے وہ گھریلو عورت ہونے یا بیٹے کے لیے ایک راستہ تھا جس کی مدد سے سوگندھی اپنے اس تاثر کو مضبوط کرتی تھی جو اس کے اندر ایک اچھی عورت کے حوالے سے پایا جاتا تھا۔ اس کا اپنے بارے میں یہ تصور کلمہ ہونے سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ وہ آئینے میں پچھلے پانچ چھے سالوں سے اپنا عکس دیکھتی آرہی تھی۔ اسی آئینے میں بہت سے عکس گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ آئینہ اُس کے لیے Other کا کام کرتا رہا تھا جس میں وہ اپنا آپ دیکھتی تھی۔ سیٹھ بھی اُس کے لیے other ہی تھا۔ آئینہ اُسے سب اچھا کی خبر سناتا تھا مگر سیٹھ نے نفرت بھری ہونہہ سے اُس کے سارے تاثرات جو اُس کے اپنے بارے میں تھے کو ملیامیٹ کر دیا۔ سوگندھی کی ایگو پر سیٹھ لفظ "ہونہ' سے حملہ آور ہوتا ہے اور اس حملے سے پیدا ہونے والی نفسی توانائی کو وہ مادھو پر انڈیل دیتی ہے اور خود

بالکل خالی ہو جاتی ہے اور سکون سے سو جاتی ہے۔ جو خیال اور حملے وہ اس ہونے کے نتیجے میں محسوس کرتی ہے وہ سارے کے سارے مادھو کے لیے استعمال کرتی ہے۔

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی: "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ایسی کون سی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے... تیری پکوڑا ایسی ناک... یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا۔ یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے۔ یہ تیرے بڑھے ہوئے کان، یہ تیرے مُنہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟... تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اور... پسند کیوں ہوتا تیرے عیب جو چھپا رکھتے تھے اُس نے... (۸) اس موقع پر سوگندھی ایک جملہ کہتی ہے۔ یہ وہ جملہ ہے جو دراصل اس کے اپنے ہی بارے میں ہے مگر وہ کہتی خود کلامی کے انداز میں ہے اور اس کا مخاطب مادھو ہی ہوتا ہے۔

"وہ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی بڑا... (۹) اس ساری صورت حال کے بعد جب سوگندھی اپنا پورا بدلہ اتار لیتی ہے اور جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے تو وہ بالکل خالی ہو جاتی ہے۔ یہی فرائیڈ کہتا ہے کہ جب لبیڈو اپنی توانائی کا اظہار یا اخراج کر لیتی ہے تو پھر شرمندگی یا خالی پن جنم لیتا ہے۔ اسے منٹو یوں بیان کرتا ہے: ایسا ستاتا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے... جیسے مسافر اُتار کر اب کوبے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔" (۱۰) جارحیت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے اپنا مطیع بنا لیتی ہے۔ اس کے لیے وہ اپنی بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ مطیع قوم پر اس طرح اپنا تسلط جماتی ہے کہ ان کے ذہنوں کو بھی اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ نو آبادیاتی مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکمران قوم یا تو آبادکار غلام قوم کو جاہل اور کم علم ثابت کرتے ہیں اور ان کی تربیت کے بہانے وہ ان پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

اگر اس بحث کو فرائیڈ کے شخصیت کے تشکیلی نظریے (psychoanalytic theory) اور نو آبادیاتی (colonial) تناظر میں دیکھا جائے تو معاملہ مزید گہرائی اختیار کر لیتا ہے۔ فرائیڈ کے مطابق انسانی شخصیت کا بنیادی ڈھانچہ ابتدائی سماجی تعلقات، خصوصاً ماں باپ کی روک ٹوک، سزا و جزا اور اختیار کے تجربات سے تشکیل پاتا ہے۔ بچہ جس ماحول میں پروان چڑھتا ہے وہاں اسے مسلسل حدود (restrictions)، حکم (authority) اور کنٹرول (control) کا سامنا ہوتا ہے، جو اس کے لاشعور میں اطاعت، خوف اور مزاحمت جیسے رجحانات پیدا کرتا ہے۔ اگر اسی تصور کو نو آبادیاتی نظام پر منطبق کیا جائے تو نو آبادکار طاقتیں بھی بالکل اسی نفسیاتی طریقہ کار کو اجتماعی سطح پر استعمال کرتی ہیں۔ وہ ایک ایسی ریاستی و ادارہ جاتی ساخت قائم کرتی ہیں جس میں قانون سازی اور قانون کے نفاذ کے ادارے بظاہر نظم و ضبط کے لیے ہوتے ہیں، مگر عملی طور پر یہ طاقت کے عدم توازن کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان اداروں کے ذریعے غلام یا محکوم قوم کی شناخت، خودی اور اجتماعی نفسیات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس عمل میں قوانین سب کے لیے یکساں نہیں ہوتے بلکہ حکمران طبقے کے لیے آزادی اور رعایت جبکہ محکوم قوم کے لیے سختی، نگرانی اور سزا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یوں قانون انصاف کا نہیں بلکہ طاقت کے تحفظ کا آلہ بن جاتا ہے۔

یہی نو آبادیاتی تضاد منٹو کے افسانے **"نیا قانون"** میں انتہائی علامتی انداز میں سامنے آتا ہے۔ استاد منگو اس افسانے میں اس محکوم طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی فطری ذہانت، تجربے اور سماجی شعور کے باوجود نو آبادیاتی نظام کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ نظام کو سمجھنے اور اس پر طنز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر جب عملی تصادم پیش آتا ہے تو ریاستی طاقت کے سامنے اس کی عقل و دانش بے معنی ہو جاتی ہے۔ افسانے کے اختتام پر استاد منگو کا منہ تکتے رہ جانا دراصل اسی نو آبادیاتی حقیقت کی علامت ہے کہ جہاں قانون

طاقت کے ساتھ جڑا ہو وہاں مقامی شعور، مزاحمت یا دانش محض ایک تماشے میں بدل جاتی ہے۔ اس کی عقل مندی اس نظام میں مزاحمت کے بجائے ایک بے بسی اور بے وقوفی کی علامت بن جاتی ہے، کیونکہ طاقت کا بیانیہ اس قدر غالب ہوتا ہے کہ مقامی ذہانت اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔ منٹو کا یہ افسانہ صرف ایک مزاحیہ یا سادہ واقعہ نہیں بلکہ نو آبادیاتی طاقت، قانون، شناخت اور نفسیاتی دباؤ کے باہمی تعلق کو بے نقاب کرتا ہے، جو فرائیڈ کے نظریۂ شخصیت کی روشنی میں اجتماعی لاشعور اور دبی ہوئی مزاحمت کی ایک صورت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ افسانے کے آخری جملے یہ ہیں:

نیا قانون، نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو...

قانون وہی ہے پرانا۔

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ (۱۱)

انگریزوں میں ہندوستان میں غلام قوموں کی نفسی توانائیوں کا رُخ ایک دوسرے کی جانب کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ہندو مسلم فسادات انگریزوں کی آمد سے قبل تاریخ میں نظر نہیں آتے۔ انگریزوں کی جارحیت کے نتیجے میں یہاں کے لوگوں میں پیدا ہونے والے رد عمل میں جو جارحیت پیدا ہوئی اُس نے ہندو مسلم کو ایک دوسرے کے خلاف جارحیت پر اُبھارا۔ تقسیم کا تصور اور نفرت کے نتیجے میں پیدا ہوا اور اس طرح لوگوں کو جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے تقسیم ہونا پڑا۔ اسی تقسیم نے دو دوستوں کے درمیان بھی نفرت پیدا کر دی۔ اس نفرت کا اظہار دونوں ملکوں کی سرحدوں پر ہوتا رہا۔ اس نفرت کا اظہار کشمیر کے محاذ پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اس نفرت کا بیج انگریز بو گئے ہیں۔ اس موضوع پر منٹو نے بہت بار قلم اُٹھایا ہے۔ اس کا افسانہ "آخری سیلوٹ کشمیر کے محاذ پر جنگ کو موضوع بناتا ہے۔ کشمیر کے تنازع کے باعث دونوں ملکوں پاکستان اور ہندوستان میں نفرت اور جارحیت بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ نو آبادکاروں نے وطنیت کے نظریے پر ضرب لگائی اور رشتوں، ناتوں، مجوں، دوستیوں کو ملک کی تقسیم کے نام پر تقسیم کر دیا۔ منٹو ایسی تقسیم کا شدید مخالف تھا۔ جارحیت کے مظاہرے کا ایک اہم مظہر گالی یا دشنام طرازی ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک گالی اس وقت دی جاتی ہے جب کسی کی عزت نفس کو مجروح کرتا مقصد ہو۔ سرحد کے اُس پار سے اور اس پار سے ایک دوسرے کو گالیاں دے کر جارحیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چوں کہ فوجیوں کی تربیت ہی اس طور کی جاتی ہے کہ وہ وطن کی خاطر جان لیتے بھی ہیں اور جان دیتے بھی۔ تو اس افسانے میں نفرت فوجیوں کی نفسی توانائی کو ابھارتی ہے اور خود پہ قابو رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ انسانی جان اور انسانی رشتوں کا بھی خون کر دیتے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں رب نواز کی گولی کا نشانہ خود اُس کا اپنا دوست بن جاتا ہے جو تقسیم کی وجہ سے اس سے دُور ہو جاتا ہے اور وطن پرستی کی نظر میں وہ اس کا دشمن ہے۔ یہ ایک المیہ ہے۔ جب رب نواز اپنی جارحیت کا مظاہرہ کر چکتا ہے تو پھر اس کے بعد اس کے پاس دُکھ اور پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ رب نواز کہتا ہے:

"قسم وحدہ لاشریک کی... میں نے ایسے ہی بندوق چلائی تھی... مجھے معلوم تھا کہ

تو ھوتے سنگ باہر نکل رہا ہے... مجھے افسوس ہے۔" (۱۲)

ملک کے تقسیم سے قبل جارحیت کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ منٹو کے افسانوں میں آبی جارحیت کے معاملے کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس موضوع پر یزید بہت اہم افسانہ ہے۔ کریم داد اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے اندر جارحیت کے مقابلے کا ایک نہایت منفرد انداز پایا جاتا ہے۔ وہ جارحیت کا مقابلہ زبانی کلامی کرنے کا قائل نہیں بل کہ عملی طور پر جارحیت کا راستہ روکنے کا قائل ہے۔ اس افسانے میں لوگ جارحیت کا مقابلہ گالی سے کرتے ہیں لیکن کریم داد مختلف سوچ کا حامل ہے۔ اس کے فوق الانا اُس کی جارحیت کے اظہار کے لیے ایک منفرد راستہ اختیار کرتی ہے اور وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کا نام یزید رکھ کر اپنی جارحیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے پوچھنے پر یہ کہتا ہے: کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا "ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو... اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا... یہ کھولے گا۔" (۱۳) گالی کے حوالے سے بھی کریم داد کے جو خیالات ہیں وہ بہت اہم ہیں اور خاص: ے دل چسپ بھی۔ ملاحظہ کریں:

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتھو کے حلق میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم داد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا؟ کیا کہا؟ کریم داد نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا: "میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا: کسی کو کیا لگتے ہیں وہ تمھارے؟ ... کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا "میرے دشمن لگتے ہیں..." "کیا فائدہ ہے یار... وہ پانی بند کر کے تمھاری زمینیں بنجر بنانا چاہتے ہیں اور تم انھیں گالی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ حساب بے باقی ہوا۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔' (۱۴)

گالی یا زبانِ طعن کو اگر انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو یہ اکثر ایک شخص کی ذاتی کمزوری، محرومی یا بے بسی کا اظہار ہوتی ہے، لیکن جب یہی رویہ اجتماعی یا قومی سطح پر اختیار کیا جائے تو یہ ایک پوری قوم کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرنے لگتا ہے۔ کمزور اقوام یا وہ معاشرے جو سیاسی، معاشی یا تہذیبی دباؤ میں ہوتے ہیں، وہ براہِ راست مزاحمت کی بجائے بعض اوقات گالم گلوچ، طنز یا جارحانہ زبان کے ذریعے اپنی اندرونی بے چینی اور مجروح عزتِ نفس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ رویہ دراصل قوت کی عدم موجودگی میں ایک علامتی ردِ عمل ہوتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی شکست خوردگی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس طاقتور اقوام یا مضبوط سماجی ڈھانچے اپنی عزتِ نفس یا وقار پر حملوں کا جواب زیادہ منظم، حکمت عملی پر مبنی اور ادارہ جاتی انداز میں دیتے ہیں۔ ان کے ہاں جذباتی ردعمل کی بجائے سیاسی، قانونی یا سفارتی سطح پر ردِ عمل سامنے آتا ہے۔ یہی فرق طاقت اور کمزوری کے بیانیے کو واضح کرتا ہے، جو ادب میں بھی مختلف شکلوں میں جھلکتا ہے۔ اگر منٹو کے افسانوی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں جارحیت صرف ایک سطحی یا جذباتی کیفیت کے طور پر موجود نہیں، بلکہ یہ انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اتر کر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ منٹو کے کردار اکثر ایسے سماجی نظام میں جکڑے ہوتے ہیں جہاں محرومی، تشدد، جنسی دباؤ، معاشی ناہمواری اور اخلاقی تضادات مل کر ایک مسلسل اندرونی کشمکش پیدا کرتے ہیں۔ یہی کشمکش کبھی گالی کی صورت میں، کبھی جسمانی تشدد کی صورت میں اور کبھی خاموش ذہنی کرب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں جارحیت ایک واحد رجحان نہیں بلکہ ایک کثیر الجہتی حقیقت ہے، جو فرد سے لے کر معاشرے اور معاشرے سے لے کر اجتماعی ذہن تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جارحیت کبھی دبے ہوئے غصے کی شکل میں ابھرتی ہے، کبھی بے بسی کے طنز

میں ڈھل جاتی ہے اور کبھی براہِ راست تشدد بن کر سامنے آتی ہے، جس سے منٹو کا افسانوی کینوس انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کا بھرپور عکاس بن جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر اردو افسانہ اسلام آباد: پورب اکادمی ۲۰۱۵ء، ص: ۱۲۲

۲۔ ایضاً ص: ۱۳۲

۳۔ حامد بیگ مرزا اردو افسانے کی روایت اسلام آباد: اکادمی ادبیات ۱۹۹۹ ص: ۷۵-مجید امجد "کلیاتِ مجید امجد" (مدونہ) خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز ۲۰۰۳ ص: ۱۳۲، طاہر اص: غر (مدونہ یہ ہے منٹو فن لاہور: مکتبہ جدید سنہ ندارد ۲۲۵)

۶۔ ایضاً، ص: ۱۴۷

۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۰

۸۔ امجد طفیل (مرتبہ) کلیات منٹو جلد اول، اسلام آباد، نے رے نیوز ۲۰۱۲ء، ص: ۱۹۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً ص: ۱۹۴

۱۱۔ ایضاص: ۷۰

۱۲ - سعادت حسن منٹو "منٹو نامہ" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۷، ص: ۱۲۵

۱۳۔ ایضاً ص: ۱۰۸

۱۴۔ ایضاً ص: ۱۰۶، ۱۰۵

References in Roman Script:

1. Shafiq Anjum, Dr., Urdu Afsana, Islamabad: Purab Academy, 2015, p. 122.
2. Ibid., p. 132.
3. Hamid Baig Mirza, Urdu Afsanay Ki Riwayat, Islamabad: Academy of Letters, 1999, p. 75.
4. Majeed Amjad, Kulliyat-e-Majeed Amjad, (Mudawwana) Khawaja Muhammad Zakariya, Lahore: Al-Hamd Publications, 2003, p. 132.
5. Tahir Asghar (Mudawwan), Yeh Hai Manto Fun, Lahore: Maktaba Jadeed, Sanah Nadarad, p. 225.
6. Ibid., p. 147.
7. Ibid., p. 120.
8. Amjad Tufail (Murattaba), Kulliyat-e-Manto, Vol. I, Islamabad: Nairang-e-Khayal Publications, 2012, p. 193.
9. Ibid
10. Ibid., p. 194.
11. Ibid., p. 70.
12. Saadat Hasan Manto, Manto Nama, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007, p. 125.
13. Ibid., p. 108.
14. Ibid., p.105–106.